پروفیسر رشید احمد

فارابی کے سیاسی افکار

وسعت و رقبہ کے اعتبار سے بنو عباس کی حکومت اپنے اموی حریف کے مدِ مقابل نہ تھی۔ منصور ہی کے زمانے میں اسپین ہمیشہ کے لیے علٰحدہ ہو گیا۔ مغرب میں ادریسی حکومت کا قیام ہارونی عہد میں عمل میں آیا۔ خراسان میں طاہری اور یمن میں زیادی حکومتیں مامونی عہد کی پیداوار ہیں۔ متوکل کے قتل کے بعد حالات اور بھی زیادہ خراب ہو گئے۔ بہت سے عباسی صوبے خود مختار بن بیٹھے۔ ان آزاد اور خود مختار حکومتوں کے وجود میں آجانے سے اسلامی اتحاد اور خلافت کے وقار کو سخت صدمہ تو ضرور پہنچا لیکن اس نقصان کی تلافی بڑی حد تک علوم و فنون کی ترویج و اشاعت نے کر دی۔ جا بجا حکومتوں کا قیام متعدد علمی مرکزوں کے وجود میں آنے کا سبب بنا۔ بجائے ایک بغداد کے بے شمار بغداد پیدا ہو گئے۔ ہر دار السلطنت میں علماء و فضلاء کی ایک معتدبہ جماعت موجود رہتی تھی۔ ہمدانی دربار اپنی تمام ہمعصر حکومتوں سے اس بات میں گوئے سبقت لے گیا۔ ہمدانی خاندان اگرچہ نہ ہی رقبۂ ممالک اور نہ مدّت حکومت کے اعتبار سے کسی ممتاز حیثیت کا مالک تھا لیکن ہمدان کے پوتے سیف الدولہ کی علم دوستی اور علماء نوازی نے اس خاندان کو زندہ جاوید بنا دیا۔ سیف الدولہ کے دربار میں متنبی جیسا شاعر، ابو الفرج اصفہانی جیسا ادیب اور سب سے بڑھ کر ابو نصر فارابی جیسا فلسفی اور مفکر موجود تھے۔

حالات زندگی

فارابی دنیائے اسلام کا مشہور ترین فلسفی اور مفکر ہے۔ اس کا پورا نام محمدؐ بن محمدؐ بن ترخان اور کنیت ابو نصر ہے۔ وہ ۲۵۶ھ مطابق ۸۷۰ء میں ترکستان کے ضلع فاراب کے مقام واسج یا ویسج میں پیدا ہوا۔ فاراب دریائے جیحون کے کنارے واقع ہے اور آج کل اترار (OTRAR) کہلاتا ہے۔ فاراب ہی کی نسبت سے ابو نصر فارابی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس زمانے میں بغداد سب سے بڑا تعلیمی مرکز تھا۔ شائقین حصولِ علم کی خاطر بغداد ہی کا رُخ کرتے تھے۔ فارابی بھی صغر سنی ہی میں بغداد پہنچا۔ اس وقت وہ عربی زبان سے بھی ناواقف تھا۔ اس لیے سب سے پہلے عربی زبان سیکھی اور اس میں مہارت حاصل کر لی۔ اس کے بعد عیسائی طبیب ابو بشر متی بن یونس سے منطق پڑھی۔ متی متعدد یونانی کتب کا سریانی سے عربی میں ترجمہ کرنے کی وجہ سے مسلم الثبوت استاد مانا جاتا تھا۔ اسی کی توجہ کا نتیجہ تھا کہ فارابی کو منطق سے بے حد لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اور منطق کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے فارابی حران گیا جہاں ایک اور عیسائی

فلسفی یوحنا بن حیلان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ حران سے بغداد واپس آکر اس نے ارسطو کے فلسفہ کی طرف توجہ کی۔ اس نے اس میں اس قدر کمال حاصل کیا کہ وہ بجا طور پر پہلا مسلمان فلسفی سمجھا جاتا ہے جس نے ارسطو کے فلسفہ کو کما حقہٗ سمجھا۔ اگرچہ یونانی فلسفہ کی کتابوں کے ترجمہ کی ابتدا منصور ہی کے زمانے میں ہوگئی تھی اور ہارون اور مامون کے عہد میں تقریباً تمام کتابیں عربی میں منتقل کر لی گئی تھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کتابوں کا صرف ترجمہ ہوا تھا اور انہیں بجائے یونانی اور سریانی کے عربی کا جامہ پہنا دیا گیا تھا لیکن انہیں مکمل طور سے کوئی سمجھتا نہ تھا۔

ہمدانیوں نے جب حلب فتح کر لیا اور اپنا دارالسلطنت بجائے موصل کے حلب کو قرار دیا تو فارابی بغداد سے حلب آیا اور سیف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہوگیا۔ ۹۴۶ء میں دمشق پر بھی ہمدانیوں کا قبضہ ہوگیا تو فارابی دمشق آگیا اور یہاں صوفیانہ زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ سیف الدولہ کی طرف سے ۴ درہم یومیہ مقرر تھے۔ یہ قلیل رقم بھی اس کی ضروریات سے فاضل تھی۔ ۳۳۹ھ مطابق ۹۵۰ء میں فارابی نے وفات پائی اور دمشق میں مدفون ہوا۔

تصانیف

فارابی نے تقریباً تمام علوم متداولہ پر خامہ فرسائی کی ہے۔ البتہ اس کی فلسفہ و منطق کی تصانیف نے جو شہرت حاصل کی وہ دوسری کتابوں کو نصیب نہیں ہوئی۔ فارابی ارسطو کی کتابوں کے شارح کی حیثیت سے بہت مشہور ہے اور اسی وجہ سے وہ معلّم ثانی کہلایا، معلّم اول خود ارسطو تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بوعلی سینا نے بھی فارابی کی کتابوں کی مدد سے ارسطو کے فلسفہ کو سمجھا۔ فارابی نے ارسطو کی کتاب "اخلاقیات" پر بھی تبصرہ لکھا اور افلاطون کی کتاب "قانون" کا خلاصہ تیار کیا۔ فلسفہ کے علاوہ فارابی کی منطق پر شہرۂ آفاق کتاب "شرح ایساغوجی" ہے۔ سائنس میں طبیعیات، موسمیات نیز فلکیات پر اس کی گرانمایہ تصانیف ہیں۔ نفسیات اور ماوراء الطبیعیات جیسے سنگلاخ میدان بھی فارابی کے قلم کی جولاں گاہ بنے۔ "کیمیائے تابش" علم کیمیا اور علم سحر پر عمدہ کتاب سمجھی جاتی ہے اس نے ریاضی کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے اور اقلیدس پر اس کے تبصرہ نے اہل یورپ سے بھی خراج تحسین حاصل کیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان خشک مضامین کے ساتھ ساتھ فارابی موسیقی جیسے فن لطیف میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔ رباب کا موجد اور عود کا ماہر تھا۔ اور سیف الدولہ کے دربار میں اپنی نغمہ سرائی سے سامعین کو مسحور کر دیتا تھا۔ وہ چاہتا تو لوگوں کو مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ کر دیتا یا انہیں اس قدر رلاتا کہ آنسوؤں کا سیلاب بہ نکلتا۔ فارابی نے گیت بھی لکھے ہیں اور فن موسیقی پر کتاب بھی تصنیف کی ہے۔ اس نے یونانی موسیقی میں بے شمار خامیاں دیکھی تھیں ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے اس نے کتاب الموسیقی الکبیر لکھی جس کا ترجمہ تقریباً تمام یورپی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

ہم نے فارابی کی تصانیف کا سرسری جائزہ اس لیے لیا ہے کہ اس کی جامعیت واضح ہو جائے۔ ہمیں سردست اس کی صرف انہی کتابوں سے سروکار ہے جن کا موضوع سیاسیات ہے۔ سیاست پر اس کی مندرجہ ذیل تصانیف ہیں (۱) افلاطون کی کتاب "قانون" کا خلاصہ (۲) سیاست المدنیہ (۳) آراء اہل المدینۃ الفاضلہ (۴) جوامع السیاست (۵) اجتماع المدنیہ۔

ان تصانیف میں سیاست المدنیہ اور آراء اہل المدینۃ الفاضلہ نے زیادہ شہرت حاصل کی۔ اور ان ہی دونوں کتابوں میں فارابی نے اپنے تمام سیاسی افکار و نظریات بیان کر دیئے ہیں۔ پہلی کتاب یعنی سیاست المدنیہ اگرچہ زیادہ ضخیم نہیں ہے تاہم شاید ہی کوئی ایسا سیاسی نظریہ ہو جو اس میں بیان نہ کیا گیا ہو۔ اس کتاب کی ابتداء انسان اور دیگر حیوانات کے باہمی فرق سے کی گئی ہے اور اسی سے انسانی تعاون کی ضرورت ثابت کی گئی ہے اور انسانی قویٰ خصوصاً قوّتِ تنازع اور اس کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ معیاری شہر اور اس کے رئیس اوّل کی اہمیت، صلاحیت وغیرہ سے بحث کی گئی ہے اور مختلف اقسامِ حکومت جو قدیم زمانے سے رائج ہیں اس کتاب کے موضوع ہیں۔ دوسری کتاب یعنی آراء اہل المدینۃ الفاضلہ ۳۴ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے معیاری شہر، اس کی ضرورت اور اس کے نظم و نسق وغیرہ کا تفصیلی بیان ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ نیز اشتراکیت اور انفرادیت سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اور انسانی اجتماع کے اسباب بیان ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب میں افلاطون کی تصنیف جمہوریہ (REPUBLIC) کا چربہ اتارا گیا ہے۔ تاہم افلاطون کی اندھی تقلید نہیں کی گئی ہے۔ اکثر مواقع پر فارابی نے اختلاف کیا ہے اور افلاطون کے نظریات کی اصلاح کی ہے۔ آراء میں ایسے بھی عنوانات ملتے ہیں جو "جمہوریہ" میں نہیں پائے جاتے۔ آراء کو "ری پبلک" کا اصلاح شدہ ضمیمہ کہنا بہت حد تک درست ہوگا۔

فارابی اوّلاً و آخراً منطقی تھا یہی وجہ ہے کہ اس کی تصانیف میں منطق غالب نظر آتی ہے۔ وہ اپنے افکار کے استدلال میں منطق ہی سے مدد لیتا ہے اور جابجا مثالیں دے کر اپنے دعووں کو ثابت اور واضح کرتا ہے۔ فارابی چونکہ مختلف علوم میں نہ صرف دسترس بلکہ مہارت رکھتا تھا اس لیے اپنے نظریات کے قیام نیز ان کو ثابت کرنے کے لیے مختلف علوم سے کام لیتا ہے۔ سیاسی کتابوں میں بھی نفسیات، اخلاقیات اور ماوراء الطبیعات کی جابجا جھلکیاں ملتی ہیں۔ اجتماع انسانی کی ضرورت ثابت کرنے کے لیے انسانی قویٰ نیز انسان اور دیگر حیوانات میں فرق ظاہر کیا گیا ہے۔

فارابی کا معمول تھا کہ وہ اپنی تصانیف کو منتشر اوراق پر لکھا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کتابوں میں ربط و ہم آہنگی کم ہے۔ اور چونکہ ان اوراق پریشان میں سے اکثر ضائع ہو گئے ہیں اس لیے کچھ کتابیں ایسی بھی

ہیں جن کے محض ایک یا دو باب ہی دستیاب ہوتے ہیں ۔

سیاسی نظریات

افکارِ فارابی کے بیان کرنے سے پہلے یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ فارابی کی تمام تر کوشش ایک طرف شریعت اور فلسفہ کی تطبیق ہے اور دوسری طرف خود ارسطو اور افلاطون کے نظریات میں مطابقت پیدا کرنا ہے سیاسی نظریات میں وہ افلاطون سے بہت زیادہ متاثر ہے لیکن جہاں وہ افلاطون سے اختلاف کرتا ہے تو اکثر ارسطو کا نظریہ پیش کر دیتا ہے ۔ فارابی کے نظریات بڑی حد تک تصوری و خیالی ہیں تاہم اس نے معاصرانہ حالات سے بالکل چشم پوشی نہیں کی ۔ معیاری ریاست کے مقابلے میں غیر معیاری ریاست کا نظریہ پیش کیا ہے جو تمام کا تمام اس کے اپنے زمانے کے حالات کا صحیح آئینہ دار ہے ۔

انسان

فارابی نے انسان اور دیگر حیوانوں میں مابہ الامتیاز عقل الفعال کو قرار دیا ہے ۔ اس کے نزدیک عقل الفعال ہی انسان کو بامِ عروج پر پہنچا دیتی ہے ۔ اور ذہن انسانی جس کو وہ عقل المستفاد کے نام سے یاد کرتا ہے ، بروئے کار لاتی ہے ۔ عقل الفعال کے بغیر عقل المستفاد بے حس و حرکت رہتی ہے جس طرح کہ سورج کے بغیر آنکھیں بیکار ہوتی ہیں ۔ فارابی نے انسان میں دو ایسی قوتوں کو مانا ہے جو دیگر حیوانات میں نہیں پائی جاتیں وہ قوۃ الناطقہ اور قوت النزوعیہ ہیں ۔ انسان قوتِ ناطقہ کے ذریعہ علم حاصل کرتا ہے اور خیر و شر ، نیک و بد اور نفع و نقصان میں تمیز کرتا ہے ۔ قوتِ نزوعیہ انسان میں کسی چیز کی محبت یا اس سے نفرت پیدا کرتی ہے ۔ ایسی قوت کے باعث رنج و خوشی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں ۔

فارابی کا انسان مدنی الطبع نہیں ہے جس طرح ارسطو نے سمجھا ہے بلکہ وہ اپنی قوت النزوعیہ کے باعث بڑا جھگڑالو ہے لیکن قوتِ ناطقہ اسے اپنی اس طبیعت و جبلت پر قابو پانے کے لیے راہ ہموار کر دیتی ہے ۔ اور وہ باہمی فوائد کے پیشِ نظر آپس کے جھگڑوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے ۔

اجتماع

انسان اگرچہ فطری طور پر جنگ جو ہے لیکن وہ اپنی ضروریات کی نوعیت نیز سامانِ زندگی کی فراہمی کے خیال سے مل جل کر کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دوسروں کے تعاون کے بغیر وہ نہ تو ضروریاتِ زندگی حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے ۔ لیکن انسان کا یہ میل جول یا اجتماع ایک ہی طرح کا نہیں ہوتا ہے بلکہ اس انسانی اجتماع کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں ۔ کچھ اجتماع ناقص ہوتے ہیں اور

کچھ تمام۔ فارابی گاؤں یا شہروں کے محلّوں یا سڑکوں کے کنارے کی بھیڑ بھاڑ کو ناقص اجتماع کی مثال کے طور پر پیش کرتا ہے۔ شہر کو وہ اجتماع تام کہتا ہے۔ شہر کے بعد ملّت یعنی زمین کے مخصوص علاقہ کے اتحاد کا نمبر آتا ہے اور کرۂ ارض کے تمام باشندے فارابی کے نزدیک سب سے بڑا اجتماع ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اجتماع کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہو لیکن وہ اجتماع تام کے لیے ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ بغیر ناقص کے تام کا تصوّر ہی محال ہے۔ مثلاً ایک سڑک ٹھہرنے کی جگہ اجتماع ناقص کی چھوٹی سے چھوٹی شکل ہے۔ لیکن وہ بھی سڑک کا ایک حصّہ ہے اور اسی طرح سڑک محلّہ کا ایک جزء ہوتی ہے اور محلہ بھی شہر کا ایک ٹکڑا ہے اور شہر ملّت کی اکائی ہے۔ اور ملّت انسانیت کا جزء ہے۔ اس طرح ٹھہرنے کی جگہ کو بالواسطہ انسانیت سے تعلق ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ فارابی اجتماع انسانی کو فطری قرار نہیں دیتا۔ بلکہ اس کی غرض اور احتیاج اسے دوسروں کا تعاون حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ فارابی کا یہ نظریہ اس کے ہمعصر سیاسی حالات کی پیداوار ہو۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں بہت سی خود مختار حکومتیں معرضِ وجود میں آگئی تھیں اور ان میں سے اکثر مرکزی عباسی خلافت سے نہ صرف اختلافات رکھتی تھیں بلکہ عباسیوں کو خلافت کا صحیح حقدار بھی نہیں سمجھتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود انہیں اس بات کا احساس تھا کہ اگر انہیں خلافتِ عباسیہ کی حمایت اور خلیفۂ وقت کی دعائیں اور اس کے عطا کردہ لمبے چوڑے خطابات حاصل نہ ہوئے تو ان کا برسرِ اقتدار رہنا اور عوام میں عزیز بننا محال ہے۔ ان کی اسی وقتی ضرورت نے خلافت کو باقی رہنے دیا جس کی وجہ سے یہ حکومتیں باہم مخالف ہونے کے باوجود متحد نظر آتی تھیں۔ ہمارے اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ فارابی کے نزدیک معاہدۂ ترکِ حقوق باہمی پر مملکت کی بنیاد نہیں ہے بلکہ اس پر مملکت کے کاروبار کا انحصار ہے۔ وہ مملکت یا شہر کو پہلے ہی فرض کر لیتا ہے اور اس کے کاروبار کے چلانے کے لیے معاہدۂ عمرانی کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ کیونکہ خلافتِ عباسیہ پہلے ہی سے وجود میں آچکی تھی اس کے قائم رکھنے کے لیے البتہ خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔

بین الاقوامی اتحاد کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں فارابی ان سے بھی بحث کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بین المللی اتحاد کی راہ میں جغرافیائی اختلافات حائل ہیں کیونکہ یہ اختلافات آب و ہوا پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں اور آب و ہوا کا انسانی کردار بنانے اور رسم و رواج جاری کرنے میں بہت ہاتھ ہوتا ہے۔ انہیں اختلافاتِ رسوم کے باعث بنی نوع انسان متحد نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلے میں دوسری دشواری زبان کی ہے۔ ہر علاقہ میں مختلف زبانیں رائج ہیں جس کی وجہ سے اقوامِ عالم میں تبادلۂ خیال ممکن نہیں ہے جس کے بغیر بین الاقوامی اتحاد کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جغرافیائی اختلافات اور جداگانہ زبانوں کے باوجود انسان اگرچہ اتحاد کا خواہشمند اور دوسروں کی امداد کا محتاج ہے تو بھی تمام روئے زمین کے انسان ایک رشتہ میں منسلک نظر نہیں آتے۔ چونکہ ایسا اتحاد ممکن نہیں اس لیے کامل ترین

اجتماع شہر یا مملکت ہے۔ اس اجتماع کے ذریعہ انسان بہترین فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ فارابی اس مملکت کو المدینۃ الفاضلہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اسی پر اس نے اپنی کتاب آراء میں بہت زیادہ زور بیان صرف کیا ہے۔

معاہدۂ عمرانی

فارابی مملکت (اسٹیٹ) کو انسانوں کے ایک معاہدۂ عمرانی (SOCIAL CONTACT) کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی جنگ جو فطرت کے باعث اجتماع وجود میں آیا۔ اس کا کہنا ہے کہ مملکت کے قیام سے پہلے طاقتور کمزوروں پر زیادتیاں کرتا تھا جس کی وجہ سے آئے دن جھگڑے کھڑے ہوتے اور فتنہ و فساد پیدا ہوتے تھے۔ اس مسلسل خلفشار سے انسان عاجز آگیا اور اس سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے ہر شخص نے اپنی مرضی سے اپنے حقوق کا ایک حصہ ایک مرکزی قوت کے سپرد کر دیا۔

اس طرح فارابی اس نظریۂ مملکت کا بانی ہے جس نے اس کے انتقال کے تقریباً سات سو سال بعد انگلینڈ اور فرانس میں شرف قبولیت حاصل کیا۔ اگرچہ اہل یورپ اس ترکِ حقوق باہمی کے نظریہ کو پیش کرنے کا سہرا ہابس (۱۵۸۸ء تا ۱۶۷۹ء) کے سر باندھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ فارابی نے ہابس، لاک اور روسو سے بہت پہلے اور کسی حد تک خامیوں سے پاک نظریۂ مملکت پیش کیا۔ ہابس کے نزدیک انسان فطری طور پر شکی واقع ہوا ہے۔ قانون، پولیس اور فوج کی موجودگی میں بھی ایک دوسرے پر شک کرتا ہے اور اسے ہم جنسوں پر کوئی اعتماد نہیں۔ اسے خارجی حملے کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمام افراد اپنے آپ کو ایک حاکم کے سپرد کر دیں اور اس کی اطاعت کو اپنا وطیرہ بنالیں۔

ہابس اور فارابی کے نظریات میں کئی فرق ہیں اوّل یہ کہ فارابی نے اس معاہدہ کی بنیاد انسان کی جنگ جو یا فطرت پر رکھی ہے اور ہابس کے نزدیک جنگ و جدل کی بجائے ایک دوسرے پر شک و شبہ کے باعث یہ معاہدہ وجود میں آیا۔

دوسرا فرق دونوں کے نظریات میں یہ ہے کہ فارابی جملہ حقوق انسانی کے ترک کر دینے کا قائل نہیں ہے بلکہ اپنے حقوق کے صرف ایک حصہ سے دستبرداری پر اس کا عقیدہ ہے۔ پھر یہ حقوق کسی فرد کو نہیں بلکہ مرکز کے حوالہ کرنے کا حامی ہے جو مطلق العنان نہیں بلکہ خود مختلف بندشوں میں جکڑا ہوا ہے گویا کہ ہابس کا نظریہ شخصی حکومت کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور فارابی اس کے ذریعہ ایک جمہوری نظام کو وجود میں لانا چاہتا ہے۔ یہ فرق بانیانِ نظریات کے زمانے کے سیاسی حالات نیز ان کے ذاتی عقائد کے باعث پیدا ہو گیا ہے۔ ہابس کے زمانے میں چارلس اوّل اور پارلیمنٹ برسرِ پیکار تھے۔ ہابس بادشاہت کا طرفدار تھا اسی لیے اس نے اجتماع کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ خطرات کا سدِ باب کرنے کے لیے بادشاہت وجود میں آتی ہے۔ ہابس کے نزدیک بادشاہ کے خلاف بغاوت

کرنا یا اس کی شکایت کرنا انسانیت کو زمانہ ماقبل مملکت کی طرف لے جاتا ہے۔ فارابی کے زمانے میں بھی مختلف حکومتیں باہمی جنگ و جدال میں مصروف تھیں۔ اس لڑائی بھڑائی کے ختم کر دینے کی واحد صورت یہ تھی کہ یہ حکومتیں ایک مرکزی حکومت کو تسلیم کر لیں اور اپنے حقوق کا ایک حصہ اس کے حوالے کر دیں۔ فارابی ہمدانی "امیر" کا حامی تھا اور ساتھ ہی عباسی خلافت کی بقا کو بھی ضروری سمجھتا تھا۔

تیسرا بڑا فرق دونوں نظریات میں یہ ہے کہ فارابی کے نزدیک یہ خطرہ خارجی نہیں داخلی ہے کیونکہ باہمی نزاعات کو ختم کرنے اور انصاف حاصل کرنے کے لیے یہ معاہدہ عمل میں آیا ہے۔ ہابس اس جبری اجتماع کی بنیاد ہی بیرونی دشمن کے حملے کے خطرے پر رکھتا ہے۔

دونوں نظریات میں ایک اہم فرق اور بھی ہے، وہ یہ کہ ہابس کا کہنا ہے کہ اس معاہدہ میں شرکت رضامندی سے بھی دی جا سکتی ہے اور جبر سے بھی۔ لیکن دونوں صورتوں میں معاہدہ اٹل ہوتا ہے اور کسی کو اس کے ختم کر دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ جو علاقے بزور شمشیر فتح کیے جائیں ان کے باشندوں پر اطاعت واجب ہے۔ فارابی کا معاہدۂ عمرانی رضا و رغبت پر مبنی ہے اگرچہ وہ مدینۃ الفاضلہ کے مقابلہ میں مدینۃ التغلب کا بھی قائل ہے جس پر اگلے صفحات میں روشنی ڈالی جائے گی۔

جان لاک (۱۶۳۲ء تا ۱۷۰۴ء) نے معاہدۂ عمرانی کو تسلیم ضرور کیا ہے لیکن اس نے اس معاہدہ کی بنیاد نہ تو فارابی کی طرح انسان کی فطری مخاصمت پر رکھی ہے اور نہ ہی ہابس کی طرح خوف و شک پر۔ بلکہ لاک کے نزدیک معاہدہ کی وجہ لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ امن و سکون بحال رہے اور کوئی اس پُر امن زندگی کو تباہ نہ کر سکے۔ لاک چونکہ پارلیمنٹ کا حامی تھا اس لیے وہ تمام قوت عوام کے حوالے کرتا ہے۔ فارابی ان دونوں انگلستانی مفکرین کے بین بین ہے۔ نہ تو وہ بادشاہ کو ہابس کی طرح مطلق العنان سمجھتا ہے اور نہ ہی لاک کی طرح اسے عوام کے رحم و کرم پر چھوڑتا ہے۔

فرانسیسی مفکر روسو (۱۷۱۲ء تا ۱۷۷۸ء) لاک کے نظریہ پر مزید اصلاح کرتا ہے اس کا کہنا ہے کہ انسان فطرتاً آزاد ہے لیکن اس نے ایک دوسرے کی جان و مال کی حفاظت کی خاطر ایک معاہدہ کر لیا ہے لیکن اس معاہدہ کے باوجود اس کی انفرادی آزادی قائم رہتی ہے اور یہ معاہدہ حاکم و محکوم کے درمیان نہیں ہے جیسا کہ اس کے پیشرو مفکرین کا خیال ہے، بلکہ افراد کا باہمی معاہدہ ہے۔

فارابی یورپی مفکرین کے مقابلہ میں حقیقت سے زیادہ قریب ہے اس کے نزدیک یہ معاہدۂ عمرانی مملکت کی ابتدا کا سبب نہیں ہے بلکہ اس کے بعد کا دور مملکت کی بنیاد ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس سے قبل ہی مملکت یا اجتماع وجود میں آچکا تھا۔

اقتدارِ اعلیٰ

فارابی نے افلاطون کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے معیاری مملکت یا شہر کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس معاملہ میں وہ یونانیوں سے بھی متاثر تھا۔ یونانی ریاستیں چونکہ زیادہ تر شہروں تک محدود ہوتی تھیں اس لیے یہ ریاستیں شہری ریاست کہلاتی تھیں فارابی نے بھی اپنی معیاری مملکت کو المدینۃ الفاضلہ کا نام دیا ہے۔ اس مملکت کے اقتدارِ اعلیٰ کو وہ الرئیس الاول کہتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک مقتدرِ اعلیٰ کو سب سے زیادہ عالم اور سب سے زیادہ قوی ہونا چاہیئے قرآن مجید نے بھی سربراہِ حکومت کی انہیں دونوں بنیادی صفتوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بسطۃ فی العلم والجسم (علم اور جسم دونوں میں فراخی)۔ افلاطون مزید اوصاف یہ بیان کرتا ہے (۱) جرأت (۲) فراخدلی (۳) ذکاوت، اور (۴) حافظہ اور اس کے فرائض یہ گنوائے ہیں کہ اس کے پاس نہایت ضروری اشیاء کے سوا کوئی نجی چیز نہ ہو حتیٰ کہ رہنے کے لیے مکان بھی نہ ہو۔ غذا نہایت معمولی فوجیوں جیسی استعمال کرے جس کے لیے وہ ایک مقررہ رقم شہریوں سے حاصل کر سکتا ہے۔ وہ عوام سے خود کو بلند و بالا نہ سمجھے۔ ان کے ساتھ اُٹھے بیٹھے اور کھانا کھائے۔ لوگوں کی جان و مال کی حفاظت اس کا اہم ترین فرض ہے۔

فارابی اقتدارِ اعلیٰ کی بابت افلاطون سے زیادہ واضح ہے۔ اس نے افلاطون کی طرح علم کا مبہم لفظ استعمال نہیں کیا ہے بلکہ اس کا معیار بھی بتا دیا ہے کہ وہ دوسروں کی بہ نسبت نتائج اخذ کرنے اور اصول کے متعین کرنے میں مہارت رکھتا ہو۔ فارابی کہتا ہے کہ تمام انسان بلحاظِ عقل مساوی درجہ نہیں رکھتے۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ نتائج اخذ کرنے میں ملکہ رکھتے ہیں اور دوسرے کم یا بالکل ہی اہلیت نہیں رکھتے۔ یہ قوتِ استنباط ہی قیادت و اقتدار کی جان ہے۔ صرف نتائج کا اخذ کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ ان مستنبط نتائج کو دوسروں تک پہنچا دینا بھی ضروری ہے۔ مقتدرِ اعلیٰ میں قوتِ استنباط کے ساتھ ساتھ قوتِ توصیل یا تبلیغ بھی ضروری ہے۔ فارابی اس امر سے بے خبر نہ تھا کہ فردِ واحد تمام شعبہائے حیات میں ان دونوں قوتوں کا مالک نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ایک لیڈر مملکت کے تمام باشندوں کی رہبری کر سکتا ہے اس لیے اس کا کہنا ہے کہ ہر شعبہ کے لیے مختلف لیڈر ہونے چاہئیں اور ان قائدین میں سے جو سب سے زیادہ ان قویٰ کا مالک ہوگا وہی قائدِ اوّل ہوگا۔ یہ قائدِ اوّل قائدِ دوم کی رہنمائی کرے گا اور قائدِ دوم قائدِ سوم کی علیٰ ہذا القیاس اعلیٰ ادنیٰ کی رہبری کرے گا۔ اس طرح فارابی نے نہ صرف جمہوریت کا تصوّر پیش کیا ہے بلکہ مکمل کابینہ اور مختلف عہدوں کا نظریہ بھی آج سے ایک ہزار سال پہلے دنیا سے روشناس کرا دیا ہے۔

فارابی کا خیال ہے کہ رئیسِ اوّل ایسا ہونا چاہیئے جسے دوسروں سے کچھ سیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ اور اس میں مشاہدہ اور تبلیغ کی قوت ہو اور مملکت کے تمام امور پر کنٹرول رکھنے کا ملکہ رکھتا ہو۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے

کہ اس رئیس اوّل سے زیادہ عاقل کوئی نہیں ہوتا ہے، اگر کوئی ہو تو اسے ہی رئیس اوّل بنانا چاہیئے اور پہلے کو اس کا ماتحت بنا دینا چاہیئے۔

فارابی نے مندرجہ ذیل بارہ صفات اقتدارِ اعلیٰ کے لیے ضروری قرار دی ہیں:

(۱) جسمانی لحاظ سے بے عیب ہو اور اس میں کسی قسم کا نقص نہ ہو۔

(۲) ذکی اور عاقل ہو۔

(۳) قوتِ بیانیہ اس قدر تیز ہو کہ جو کچھ کہے اس کا نقشہ سننے والے کے سامنے کھنچ جائے۔

(۴) کم سے کم بحث مباحثہ سے چیزوں کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

(۵) قوی حافظہ کا مالک ہو۔

(۶) حسبِ خواہش لوگوں پر علم کے لیے اپنی محبت واضح کر سکے۔

(۷) لہو و لعب سے متنفر ہو۔

(۸) خواہشاتِ نفسانی پر مکمل قابو رکھتا ہو بالخصوص کھانے پینے اور جنسی تعلقات کو حد سے آگے نہ بڑھنے دے۔

(۹) سچ سے محبت کرتا ہو اور جھوٹ سے پرہیز۔

(۱۰) وسیع القلب ہو اس کو عدل و انصاف سے خصوصی لگاؤ ہو اور ظلم و تشدد کے پاس بھی نہ پھٹکے۔

(۱۱) جس چیز کو بہتر سمجھتا ہو اسے بلا خوفِ تردید نافذ کر سکے۔

(۱۲) اس کا خزانہ معمور ہو اور وہ کافی دولت کا مالک ہو۔

مندرجہ بالا صفات کے حامل انسان کا ملنا محال ہے۔ حالانکہ فارابی نے خود افلاطون کے اقتدارِ اعلیٰ پر اعتراض کیا تھا کہ یونانیوں میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ انہوں نے معیار کو اس قدر بلند کر دیا ہے کہ عام انسان کا اس معیار تک پہنچنا عملاً ناممکن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فارابی نے جو صفات گنوائی ہیں وہ بہت حد تک معروضی ہیں اذعانی نہیں ہیں تاہم یہ معیار ناممکن الحصول ہے اور اس کا احساس فارابی کو بھی تھا کہ ان تمام اوصاف کا فردِ واحد میں مجتمع ہونا ممکن نہیں۔ اسی لیے اس نے خود ہی لکھا ہے کہ یہ سب کی سب خوبیاں ایک شخص میں نہیں پائی جا سکتیں۔ اگر ان میں سے پانچ یا چھ خوبیوں کا حامل دستیاب ہو جائے تو بہت حد تک عمدہ حکمران ثابت ہو سکتا ہے۔ بایں ہمہ فارابی کو اس امر کا بھی احساس ہے کہ اس قسم کا انسان بھی سہل الحصول نہیں ہے اسی لیے اس نے ایک اور متبادل تجویز پیش کی ہے کہ ایسے شخص کو رئیس اول بنانا چاہیئے جس نے ان صفات کے حامل انسان کے زیرِ تربیت پرورش پائی ہو۔ اس تجویز سے فارابی کے اس عقیدے کی طرف اشارہ ملتا ہے

کہ انسان عمدہ صفات کے لحاظ سے روبہ تنزل ہے اس کے سامنے عہد رسالت و خلفائے راشدینؓ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ بعصر خلفاء کی کمزوریاں بھی تھیں جس سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا انسان اخلاقِ فاضلہ سے محروم ہوتا جائے گا۔ فارابی کا مقصد کچھ ہی کیوں نہ ہو تاہم اتنا ضرور ہے کہ اس نے حکومت کو موروثی ضرور قرار دیا ہے یا کم از کم اس کو موروثی بنائے جانے کے لیے جواز کا دروازہ کھول دیا ہے۔

مزید براں فارابی کا کہنا ہے کہ اگر ایسا شخص بھی جس نے ان صفات سے متصف انسان کی زیر نگرانی پرورش پائی ہو نہ مل سکے تو دو یا دو سے زائد حتیٰ کہ پانچ افراد تک منتخب کئے جائیں جن میں مجموعی طور پر یہ بارھوں صفات موجود ہوں بشرطیکہ ان میں سے کم از کم ایک حکیم اور فلسفی ہو جو لوگوں کی ضروریات معلوم کر سکے اور ریاست کی فلاح و بہبود سے واقفیت رکھتا ہو۔ فارابی کا دعویٰ ہے کہ اگر ایسا فلسفی نہ مل سکے تو یقین کر لینا چاہیئے کہ حکومت چند دنوں ہی کی مہمان ہے اور زیادہ دن گزرنے نہیں پائیں گے کہ مملکت تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اس طرح فارابی کا بینہ اور جمہوریت کا واضح تصور پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کے نزدیک اصولاً تو شخصی حکومت ہونی چاہیئے لیکن بدرجۂ مجبوری جب کہ جملہ صفات سے متصف انسان ناپید ہے تو سوائے جمہوریت کے اور کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ افلاطون نے بھی اسی قسم کی متبادل تجویز پیش کی ہے اس کا کہنا ہے کہ اگر فلسفی بادشاہ (PHILOSOPHER – KING) نہ مل سکے تو اس کی جگہ چند سرپرستوں (PHYLAKES) کو دیدینی چاہیئے۔ افلاطون نے فارابی کی طرح یہ شرط نہیں لگائی کہ یہ سرپرست ایسے منتخب کیے جائیں جن میں یہ تمام صفات مجموعی طور پر موجود ہوں۔

فارابی کے اس نظریے کے متعلق ہم محض خیالی ہونے کا حکم لگا سکتے ہیں کیونکہ اس معیاری رئیس کے نظریہ کو پیش کرتے وقت اس نے اپنے زمانے کے سیاسی حالات کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لی تھیں اور عباسی خلافت کا اس زمانے میں جو حال تھا وہ فارابی کے تخیل کے بالکل برعکس تھا۔ شروانی صاحب کا خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ فارابی کے بغداد کو خیرباد کہنے اور سیف الدولہ کے دربار سے وابستگی کا سبب یہی تھا کہ اس نے سیف الدولہ کی ذات کو اپنے خیالی رئیس سے بہت قریب پایا۔

داخلی نظام

فارابی اقتدار اعلیٰ کے صفات اور فرائض کے بیان کر دینے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے معیاری شہر کے داخلی نظم و نسق کا ایک جامع خاکہ بھی پیش کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان فطری طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لیے ہر ایک صلاحیتوں کے اعتبار سے جداگانہ درجہ رکھتا ہے۔ پھر تربیت کے مواقع کچھ کو میسر آتے ہیں اور کچھ لوگ اس سے قطعاً محروم رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صلاحیتوں کا یہ اختلاف اور

بھی قدرت اختیار کر لیتا ہے اسی لیے فارابی کہتا ہے کہ رئیس اوّل کو چاہیئے کہ وہ لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق مختلف عہدوں پر فائز کرے۔ اگر صحیح معنوں میں تمام عہدے مستحق اور اہل لوگوں کے ذریعے پُر کئے جائیں تو ہم حکومت کو منظم کہہ سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ اہل و لائق افراد ہی کو عہدیدار بنانے کی طرف فارابی نے رئیس کی توجہ اس طرح مبذول کرائی ہے کہ خالق کائنات نے ہر شخص کو اس کی لیاقت کے مطابق کام سپرد کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظام عالم درہم برہم نہیں ہوتا بلکہ کائنات کے کام نہایت عمدگی سے انجام پا رہے ہیں۔ اسی طرح اگر رئیس بھی تمام عہدیداروں کو ان کی لیاقت کے مطابق کام تفویض کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ امور سلطنت نہایت خوش اسلوبی سے انجام نہ پائیں۔

فارابی رئیس اور دیگر امراء میں فرق اس طرح کرتا ہے کہ رئیس کسی سے ہدایات حاصل نہیں کرتا لیکن امراء رئیس اوّل یا دیگر افراد سے ہدایات حاصل بھی کرتے ہیں اور اپنے ماتحت عملہ کی رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح حکومت کا ہر عامل فارابی کی رائے میں حاکم بھی ہے اور محکوم بھی۔ یہاں تک کہ ایک آخری عہدہ آجاتا ہے جس پر فائز شخص کا فرض اپنے امیر بالا کی اطاعت کرنا ہے اور کسی کو حکم دینا نہیں ہے۔

فارابی نے حکومت کی مشینری کو ہربرٹ اسپنسر کی طرح جسم نامی سے تشبیہ دی ہے وہ رئیس کو قلب کہتا ہے اور دیگر اعضائے جسم عہدیداروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس طرح کہ قلب جسم کے جملہ حصوں کے کاموں کا تعین کرتا ہے اور ایک عضو کا دوسرے عضو کے ساتھ تعلق بھی ظاہر کرتا ہے بعینہٖ رئیس اوّل بھی مملکت کے مختلف طبقوں کے حقوق و فرائض کا تعین کرتا ہے۔ فارابی نے اس جسمانی مثال سے بھی عہدیداروں کی اہمیت میں فرق ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جس طرح کسی عضو کی اہمیت قلب کی قربت پر منحصر ہے یعنی جو حصہ قلب سے جتنا قریب ہوگا اتنا ہی اہم ہوگا۔ آنتیں جو قلب سے زیادہ متعلق نہیں ہوتیں زیادہ اہمیت کی مالک نہیں ہیں۔ اسی طرح جو عہدیدار رئیس سے جتنا قریب ہوگا اسی قدر وہ اہم سمجھا جائے گا۔

المدینۃ الجاہلیہ

فارابی نے المدینۃ الفاضلہ یعنی معیاری مملکت کے مقابلے میں ایک غیر معیاری مملکت کو جسے وہ المدینۃ الجاہلیہ کہتا ہے پیش کیا ہے۔ یہ مملکت معیاری مملکت کی شرائط پوری نہیں کرتی۔ ایسی حکومتیں کیوں وجود میں آجاتی ہیں فارابی اس کے پانچ اسباب بیان کرتا ہے۔

(۱) ایسی مملکت کے وجود میں آجانے کی سب سے بڑی وجہ قوّت و طاقت ہے۔ ایک طاقتور آدمی بہت سے کمزوروں کو مغلوب کر لیتا ہے اور اس طرح سے ایک حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ اس طرح فارابی نے جدید نظریہ طاقت (THEORY OF FORCE) کو پیش کیا ہے۔

(۲) ایک خاندان یا ایک کنبہ سے تعلق رکھنے والے افراد دوسروں کی بہ نسبت زیادہ متحد ہوتے ہیں۔ یہ خاندان یا قبیلہ ریاست کے قیام کا سبب بن جاتا ہے۔ فارابی نے ارسطو کے نظریۂ پدرسری (PATRIARCHAL THEORY) کو نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔

(۳) حکمران جب افراد کی باقاعدہ تنظیم کرتا ہے تو مملکت وجود میں آجاتی ہے۔

(۴) ایک زبان کے بولنے والے یا ایک ہی قسم کے رسم و رواج کے پابند گروہ متحد ہو جاتے ہیں۔ اور قیام مملکت کا باعث بنتے ہیں۔

(۵) ایک ہی خطّہ کے باشندے باہم متحد ہوتے ہیں اور یہ اتحاد مملکت کا موجب ہوتا ہے۔

مدینۃ التغلب

فارابی اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہے کہ اُس کی تصوّری مملکت کسی زمانے میں بھی ممکن الحصول نہیں ہے اس لیے اس نے مختلف قسم کی ریاستوں کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ اس سلسلے میں فارابی بڑی حد تک اپنے زمانے کی مختلف حکومتوں کی ہیئت ترکیبی سے متاثر نظر آتا ہے۔ فارابی کا کہنا ہے کہ قوی کا ضعیف کو مغلوب کر لینے کا جذبہ فطری ہے اس لیے طاقتور کا کمزور پر غلبہ حاصل کر لینا اور کمزور کا مغلوب ہو جانا عین انصاف ہے۔ ایسی ریاست کو فارابی مدینۃ التغلب کا نام دیتا ہے۔ اور مفتوح قوم پر فاتح کی اطاعت واجب بتلاتا ہے۔ اور فاتح پر بھی وہ چند بندشیں اور پابندیاں عائد کرتا ہے۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ طاقتور قوموں کو چاہیئے کہ جب وہ خون بہائیں تو مقابلہ پر بہائیں اچانک حملہ کر دینا یا بغیر کسی تنبیہ کے کسی کمزور کا مال و اسباب لوٹ لینا ان کے لیے جائز نہیں ہے۔ اس نظریہ کے بیان میں فارابی کے مدّنظر سیف الدولہ کی حکومت اور اس کی شجاعت تھی۔

نوآبادی

فارابی نے سیاست المدنیہ میں نوآبادی سے مفصّل بحث کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ نوآبادی کے وجود میں آنے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ بیرونی دشمن کے حملے کی وجہ سے لوگ دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ دوم وطن میں وبائی بیماری پھوٹ پڑنے کے باعث انتقالِ آبادی لازمی ہو جائے۔ سوم اقتصادی دباؤ یا معاشی بدحالی سے مجبور ہو کر لوگ ترک وطن کریں۔

فارابی نوآبادی کو یہ اختیار دیتا ہے کہ چاہے اس کے آباد کرنے والے اپنا نیا دستور تیار کریں یا پُرانے ہی کو برقرار رکھیں یا پرانے دستور میں حسبِ ضرورت ردّ و بدل کر لیں۔ اس طرح وہ نوآبادی کو مرکزی حکومت سے نہ صرف آزاد دیکھنا چاہتا ہے بلکہ اس کو دستور سازی کے اختیارات بھی تفویض کرتا ہے۔

اشتراکیت

اشتراکیت کے مسئلہ میں فارابی افلاطون سے اختلافِ رائے رکھتا ہے۔ افلاطون نے اپنی تصنیف "جمہوریہ" میں جہاں اپنے خیالی فرمانروا کے فرائض گنوائے ہیں وہاں اس کا فرض اوّلیں یہ بتایا ہے کہ وہ دیکھے کہ اعلیٰ طبقے کے پاس سوائے اشد مطلق ضروری اشیاء کے کوئی ذاتی ملکیت نہ ہو۔ اس نے خود اقتدارِ اعلیٰ پر نجی ملکیت حرام قرار دی ہے۔ افلاطون کا کہنا ہے کہ بادشاہوں کے پاس ذاتی مکانات یا زمین یا زر و مال ہوا تو وہ بے شک اچھے تاجر اور کسان تو بن جائیں گے لیکن محافظ مملکت نہیں رہیں گے اور بجائے عوام کے معین و مددگار بننے کے ان کے دشمن اور ظالم بن جائیں گے۔

فارابی معاہدۂ عمرانی پر عقیدہ رکھتا ہے جس کی رو سے انسان اپنی ضروریاتِ زندگی کے پیشِ نظر متحد ہوا ہے ورنہ درحقیقت ہم جنسوں کا شدید دشمن ہے اس لیے فارابی کے نزدیک اشتراکیت ناقابلِ عمل نظریہ ہے کیونکہ جو کچھ بھی برائے نام اتحاد انسانوں میں پایا جاتا ہے وہ جبری ہے۔ تاہم فارابی چند چیزوں کو افراد کے قبضہ میں دینے جانے کی بجائے ان کے مشترک ملکیت میں رہنے کا حکم صادر کرتا ہے تاہم وہ ایک محدود حد تک ذاتی ملکیت کو نہ صرف جائز بلکہ لازمی سمجھتا ہے۔ فارابی کا خیال آج بھی قابلِ عمل ہے اور دنیا کو جنگ کے شعلوں سے بچا سکتا ہے۔

اسی طرح فارابی نے سیاسیات کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے خیالات اگرچہ بڑی حد تک یونانی فلسفیوں سے ماخوذ ہیں تاہم اس نے اپنے پیشروؤں کے افکار پر کڑی تنقیدی نظر ڈالی ہے اور اپنے تجربات کی روشنی میں ان میں جابجا اصلاح کی ہے۔

حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق

مصنفہ بشیر احمد ڈار

عہد قدیم میں چین، ایران، مصر اور یونان کی تہذیبوں نے حیرت انگیز ترقی کر لی تھی۔ اور یہاں کے مفکروں نے جو افکار و نظریات پیش کئے انہی کی بنیاد پر جدید افکار کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی ہے اس کتاب میں کون فیوشس، گوتم بدھ، زرتشت، مانی، سقراط، افلاطون، اور ارسطو جیسے عظیم مفکروں کے اخلاقی نظریات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ:- ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ - کلب روڈ - لاہور